میری تمام سرگزشت.........

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب

[شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے بارے میں اگر کہا جائے کہ وہ اس وقت برصغیر کے سب سے بڑے جلیل القدر استادِ حدیث ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان کا صرف صحیح بخاری شریف پڑھانے کا عرصہ نصف صدی پر مشتمل ہے ملک اور بیرون ملک کے بڑے بڑے شیخ الحدیث آپ کے تلامذہ کے حلقے میں شامل ہیں، حضرت نے اپنی سوانح زندگی املا کرانا شروع کی ہے جسے جامعہ فاروقیہ کے فاضل اور تخصص فی الفقہ کے طالب علم مولوی شمس الحق کشمیری ضبط کر رہے ہیں، اب تک دو ڈھائی سو صفحات ہو چکے ہیں اور یوں خود حضرت کی زبان سے ان کی زندگی کی سرگزشت مرتب ہو رہی ہے، اس سرگزشت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نے بغیر تصنع و تکلف کے زندگی کے واقعات کو ہو بہو بیان کر دیا ہے، بڑے لوگوں کی سوانح پر لکھی جانے والی کتابوں میں عموماً ایک کمی یہ پائی جاتی ہے کہ وہ بچپن ہی سے طبعی زندگی سے ماوراء منفرد دکھائے جانے لگتے ہیں، سوانح نگار غالباً عقیدت کی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں لیکن اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا قاری ان کو فطری تقاضوں، طبعی زندگی کی الجھنوں اور گردش لیل و نہار کی ہمہ گیر جکڑ بندیوں سے آزاد دیکھ کر یہ تاثر لے لیتا ہے کہ جو جھمیلے والی زندگی میں گزار رہا ہوں اس میں ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا ممکن نہیں، وہ ان کی سوانح کو قابل رشک تو سمجھ لیتا ہے، قابل تقلید نہیں.......... لیکن حضرت نے اپنی اس آپ بیتی میں طبعی زندگی کے واقعات کو بغیر کسی آمیزش کے ذکر کر دیا ہے، تعلیم و تربیت اور دارالعلوم دیوبند میں اسباق کی تفصیلات پر مشتمل یہ ساتویں قسط نذر قارئین ہے، امید ہے کہ اسے ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔ سوانح یا آپ بیتی کا فی الحال یہ نام اس ناکارہ نے علامہ اقبال کے اس مشہور شعر سے اخذ کیا ہے ؎

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

(مدیر)]

قرآن مجید کے حفظ کا عجیب واقعہ: جب ہم دیوبند سے چھٹیوں میں واپس گھر آئے تو وہ برسات کا موسم تھا اور ہمیں شروع سے قرآن مجید یاد کرنے کا شوق تھا تو ہم نے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ رمضان میں ہمارا ارادہ قرآن مجید یاد کرنے کا ہے مولانا نے فرمایا کہ بھائی اب تو آپ سال بھر پڑھتے رہے ہیں پھر سالانہ امتحان دیا ہے، اب آپ کو آرام کرنا چاہیے اور روزہ بھی ہوگا پھر فرمایا کہ بھائی اگر آپ یاد کریں گے تو

کتنا یاد ہو جائے گا حضرت کا خیال یہ تھا کہ ایک دو سپارے یاد کر سکیں گے، میں نے حضرت سے کہا کہ ہم سات آٹھ سپارے انشاء اللہ یاد کر لیں گے۔ تو جب انہوں نے سات آٹھ سپارے کا سنا تو اجازت دے دی۔ ہم نے اپنے اس شوق کا اظہار والد صاحب سے بھی کیا لیکن اکثر و بیشتر میری صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ اجازت دینے کے لئے تیار نہ ہوئے ہم چونکہ اچھے خاصے بڑے ہو چکے تھے اس لئے ہم نے ان کو جلد راضی کر لیا اور ساتھ ساتھ ہم نے تراویح میں سنانے کا ارادہ بھی کر لیا کہ روزانہ ایک پاؤ سپارہ یاد کریں گے اور تراویح میں پڑھ لیں گے۔ دوسرے دن ایک پاؤ کا مزید اضافہ کریں گے تو آدھا پارہ ہو جائے گا تو جب سوا سپارہ ہو جائے گا تو آگے سے ایک پاؤ کا اضافہ کر لیں گے اور پیچھے سے اس تناسب سے کم کرتے جائیں گے تو روزانہ ایک سپارہ تراویح میں ہو جایا کرے گا۔

ہمارے گھر کے ساتھ دو مسجدیں تھیں ایک شمال کی جانب تھی اس کو ''کیلا'' والی مسجد کہتے تھے اور دوسری جنوب کی جانب تھی اس کو ''فخر شاہ'' والی مسجد کہتے تھے۔ ہمارے والد صاحب اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب مرحوم اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، اور میں ''کیلا'' والی مسجد میں نماز پڑھتا تھا تو ہم نے ''فخر شاہ'' والی مسجد میں تراویح پڑھانے کا ارادہ کر لیا کہ اس مسجد میں والد صاحب نماز پڑھا کرتے تھے، وہاں ایک حافظ صاحب تھے جو ہمیشہ سے وہیں تراویح میں قرآن سنایا کرتے تھے اور دوسری نمازوں کی امامت بھی کراتے تھے، ہم نے والد صاحب سے عرض کی کہ آپ حافظ صاحب سے اجازت لے لیں انہوں نے حافظ صاحب سے اجازت لے لی، چونکہ ہمارے والد صاحب کا وہاں اثر و رسوخ تھا اس لئے حافظ صاحب نے اجازت دے دی۔ لیکن ہمارے استاد منشی الہ بندے صاحب (جن سے ہم نے ناظرہ قرآن کریم پڑھا تھا اور وہ اسی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے) نے ہماری اس رائے کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ آپ حافظ تو ہیں نہیں، آپ کیسے سنائیں گے، لوگوں کی تراویح خراب ہوں گی، میں تو پھر کہیں اور تراویح پڑھوں گا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے آپ کہیں اور پڑھنا چاہیں تو وہاں پڑھ لیں، ہمیں کیا اعتراض ہے انہوں نے وہاں تراویح نہیں پڑھی اور ہم نے وہاں قرآن سنانے کا فیصلہ کر لیا، ہمارا خیال تھا کہ رمضان میں سات آٹھ سپارے یاد کریں گے لیکن جب پہلی تراویح آئی تو ہم نے باقاعدہ محنت کر کے تقریباً سوا سپارہ یاد کر لیا۔

ہمارے گھر کی دوسری منزل میں ایک کمرہ تھا، رمضان کے مہینے میں اسی میں قیام کیا، قرآن کریم یاد کرنے کا معمول یہ تھا کہ رات بھر ہم یاد کرتے، سحری بھی وہیں اوپر کمرے میں پہنچ جاتی تھی، فجر کی نماز ہم ''کیلا'' والی مسجد میں پڑھاتے تھے تو رات بھر پڑھنے کی وجہ سے آواز بڑی مشکل سے نکلتی تھی، پھر وہاں سے آتے ہی یاد کرنا شروع کر دیتے تھے اور بارہ بجے تک یاد کرتے، بارہ بجے کے بعد ہم لیٹ جاتے اور دو بجے ظہر کی نماز ہوتی تھی تو سترہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہیں کہ میں لیٹا ضرور مگر نیند نہیں آئی، پھر ظہر کے بعد سے عصر تک یاد کرتے۔ اور عصر کے بعد مولوی صمصام اللہ خان صاحب (جو آج کل رحیم یار خان میں ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی یہاں ہمارے پاس ملنے آیا کرتے ہیں، ان کی ننھیال لوہاری میں تھی اور ددھیال جلال آباد میں، بہت عمدہ اور بہترین قسم کے حافظ تھے) کو سنایا کرتے تھے پھر انہیں کو مغرب کے بعد نفلوں میں سناتے اور عشاء کے بعد تراویح میں سناتے۔ روانگی تو تھی نہیں

بہر حال ''جلالین'' ہم نے اسی سال پڑھی ہوئی تھی، غائب صیغوں کی رعایت سے یَعْلَمُوْن پڑھتے تھے اور حاضر کے صیغوں کے مقابلے میں تَعْلَمُوْن پڑھتے تھے، یوں معنی کی مدد بھی ہمیں حاصل تھی، بہر حال اس طرح ہم نے ستائیس تاریخ کو تراویح میں قرآن ختم کر دیا۔ اس دوران ایسا بھی ہوا کہ ایک دن میں ڈھائی سپارے ہم نے یاد کیے۔ اور وہ عصر کے بعد بیٹھ کر سنائے اور مغرب کے بعد نفلوں میں سنائے اور پھر عشاء کے بعد تراویح میں سنائے۔ اور ایسا بھی ہوا کہ بہت زیادہ زور لگانے کے باوجود ایک دن پون سپارہ ہی یاد ہو سکا۔ بہر حال کبھی کم کبھی زیادہ یاد کر کے ستائیس دنوں میں ہم نے قرآن مجید مکمل کر لیا، یہ ایک خاص واقعہ دار العلوم کے دوسرے سال کے اختتام پر رمضان میں پیش آیا۔ پھر رمضان کے بعد ہم پڑھنے کے لئے گئے تو ایسی عجیب کیفیت تھی کہ ہم نے سال بھر تلاوت نہیں کی اور یہ معلوم ہے کہ پارہ تو کیا ایک رکوع آدمی یاد کر لے اور اس کے بعد اس کو دو چار دن نہ پڑھے تو وہ بھول جاتا ہے، یہاں تو ہم نے ایک ڈیڑھ اور ڈھائی سپارے تک روز یاد کیا تھا۔ اور پھر اس کو دہرانے کی نوبت نہیں آئی تھی چونکہ اگلے دن کی تیاری ہوتی تھی۔ چار سال گزر گئے اور اس عرصے میں پھر قرآن کریم یاد کرنے کی نوبت نہیں آئی دار العلوم سے فراغت ہوگئی اور ایک سال تدریس کا پورا ہوا تو تراویح میں قرآن کریم سنانے کا ارادہ ہوا۔

جلال آباد میں حافظ صدیق حسن خان مرحوم ایک بزرگ جو وہاں کے اکثر و بیشتر حافظوں کے استاد تھے وہ مجھ سے ''قصیدہ بردہ'' پڑھا کرتے تھے، کئی مرتبہ انہوں نے مجھ سے کہا ''آپ کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے حافظ نہ ہونے کے باوجود ۲۷ دن میں تراویح قرآن سنایا ہے مگر میں اس بات کو نہیں مانتا'' میرا جواب ہوتا تھا کہ میں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا جو لوگ یہ کہتے ہیں انہی سے آپ بات کریں، مجھ سے آپ کیوں کہتے ہیں۔

۴ سال کے بعد جب میں نے قرآن کریم تراویح میں سنانے کا ارادہ کیا تو حافظ صاحب سے کہا ''اب میں قرآن کریم سناؤں گا آپ سماعت فرمائیں''، حافظ صاحب حیران بھی ہوئے اور خوش بھی، مولانا مفتی نصیر احمد مرحوم بھی سماعت کے لئے مقرر ہوئے جو بہترین حافظ اور قاری تھے، اس مرتبہ سپارہ یاد کرنے کے لئے کبھی رات کو کوشش نہیں کی، پڑھنے میں روانی بھی اچھی تھی، ایک مرتبہ ''وما ابرئ نفسی......'' کے سیپارے میں حافظ نے لقمہ دیا اور غلط دیا، میں نے قبول نہیں کیا، دو تین مرتبہ انہوں نے مجھے ٹوکا لیکن میں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور جس طرح پڑھ رہا تھا، اسی طرح پڑھ کر آگے نکل گیا۔ سلام کے بعد حافظ صاحب نے کہا آپ نے میرا لقمہ نہیں لیا، عرض کیا، میں صحیح پڑھ رہا تھا اور آپ غلط بتا رہے تھے۔ اس لئے نہیں لیا، فرمانے لگے میں سامع ہوں، سامع اگر غلط بھی بتا رہا ہو تو اس کو قبول کرنا چاہیے، مفتی نصیر احمد صاحب نے بھی تائید کی کہ یہ صحیح پڑھ رہے تھے اور آپ غلط بتا رہے تھے، میں نے یہ بھی کہا کہ آپ جو اصول بتا رہے ہیں کہ سامع اگر غلط بھی بتائے تو اس کو قبول کرنا چاہیے یہ اصول غلط ہے۔ اس پر حافظ صاحب ناراض ہو گئے اور نماز چھوڑ کر دوسری مسجد میں چلے گئے وہاں حافظ صاحب ہی کے ایک پرانے شاگرد قرآن کریم سنا رہے تھے انہوں نے جب یہ دیکھا تو سوا یا ڈیڑھ پارہ وہ پڑھتے تھے، حافظ کے آنے پر ڈھائی سیپارے پڑھے اور اگلے دن وہ

سہارنپور چلے گئے اور تراویح نہیں پڑھائی، اس کی وجہ یہ تھی کہ حافظ صاحب بوڑھے تھے، قطرے کے مریض تھے جب ان کو شبہ ہوتا تھا تو وہ طہارت کے لئے جاتے تھے، وضو کرتے تھے اور ان کے آنے تک تراویح رکی رہتی تھی، ایک آفت اور تھی کہ کبھی حافظ صاحب کو شک ہوتا تو وہ سلام کے بعد قرآن سنانے والے سے کہتے کہ فلاں رکوع پڑھو، اب اگر نماز میں غلطی نہ بھی ہوئی ہو اور سلام کے بعد پڑھنے میں غلطی ہو جائے تو رکوع لوٹواتے اور وہ رکعتیں دوبارہ پڑھواتے، اس لئے کوئی بھی ان کو قرآن کریم سنانے کے لئے خوشی سے تیار نہیں ہوتا تھا، میں ان باتوں سے واقف نہیں تھا لیکن سابقہ پیش آیا تو میں نے یہ سب کچھ ان کی مجبوری کے پیش نظر برداشت کیا بہر کیف اگلے دن پھر حافظ صاحب ہماری مسجد میں آ گئے اور ختم تک رہے ہم نے ۲۷ کو ختم کیا تھا، ۲۱ کے بعد اکثر حفاظ اپنا قرآن ختم کر کے ہماری مسجد میں آیا کرتے تھے، ہر دفعہ ایک پوری صف حافظوں کی ہوتی تھی جب ختم ہوا تو استاذ مکرم حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کی پیشانی کو بوسہ دیا اور حافظ صاحب نے اعلان کیا کہ انہوں نے ایسا قرآن سنایا ہے کہ اچھے اچھے حفاظ بھی ایسا نہیں سناتے۔ یہ محض اللہ بزرگ و برتر کا کرم و احسان تھا، ورنہ میری اوقات تو کچھ بھی نہ تھی۔

تیسرے اور چوتھے سال کے اسباق: دارالعلوم دیوبند میں تیسرے اور چوتھے سال ہمارے اسباق ''صدرا''، ''خیالی''، حمد اللہ'' شرح مواقف سے موقف خامس الٰہیات، ''قانونچہ''، ''دیوان حماسہ''، ''ہدایہ آخرین''، ''امور عامہ''، ''تقریر دلپذیر'' اور طب میں ''شرح اسباب'' تھے۔ ''صدرا'' اور ''خیالی'' کے ایک ہی استاد تھے، وہ آدھا پون گھنٹہ سیاست حاضرہ پر گفتگو فرماتے اور اس کے بعد سبق شروع کرتے تھے۔ سبق کا انداز بھی کچھ عجیب تھا، کچھ خلاصہ بیان کرتے جس سے نہ ''صدرا'' کا سبق سمجھ میں آتا اور نہ خیالی کا۔ دونوں کتابیں مشکل اور مکمل تشریح اور توضیح کی محتاج تھیں، بعد میں ہم لوگ ''خیالی'' کو عبدالحکیم کے حاشیے کی مدد سے حل کر لیا کرتے تھے۔ مگر ''صدرا'' کے لئے کوئی سہولت موجود نہیں تھی۔

''حمد اللہ'' کا حافظ: ''حمد اللہ'' ہمیں ازبر یاد تھا، شہر میں قلعہ والی مسجد کے کمرے سے دارالعلوم آتے ہوئے ہم اس کو دہرا لیا کرتے۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ''حمد اللہ'' کے استاد تھے فرماتے کہ ''طلباء کو اس کا تکرار کراؤ تاکہ وہ اچھے نمبروں میں پاس ہوں'' چونکہ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب ملتانی اس کا امتحان لیتے ہیں اور ان کے یہاں نمبر عام طور پر کم ملتے تھے۔

ایک مردانی طالب علم کا قصہ: ایک ''حمد اللہ'' کے ساتھی مردانی طالب علم سے ہم نے کہا کہ مشکل مقامات کی نشاندہی کر دیں تاکہ ان کو خوب اچھی طرح محفوظ کر لیا جائے وہ فرمانے لگے کہ پوری کتاب کو اچھی طرح یاد کرو، مشکل مقامات کی بات کو چھوڑ دو پھر کہا کہ ۱۸/ سال مجھے دارالعلوم میں ہو گئے ہیں، جب آیا تھا تو اس وقت دیوبند کا اسٹیشن دیکھا تھا پھر نہیں دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ میں ہمہ تن تحصیل میں مشغول ہوں اور کتابوں پر عبور حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوں، ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چلے آئے۔

مولانا اعزاز علی صاحب کا طریقہ تدریس: ہدایہ اخیرین کا سبق حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے یہاں تھا،

ن کا پہلا اور دوسرا گھنٹہ تھا، لیکن مولانا فجر کی نماز کے فوراً بعد سبق شروع کردیا کرتے تھے، اس لئے یہ سبق روزانہ ائی یا تین گھنٹے ہوتا تھا۔ درسگاہ میں سبق کے شروع ہونے کے وقت اچھا خاصہ اندھیرا ہوتا تھا۔ مولانا کی نشست ملہ دروازے کے ساتھ تھی اس لئے ان کو کچھ روشنی میسر ہوتی تھی، اس زمانے میں درسگاہوں اور دارالاقامہ میں نہ تو لی کا انتظام تھا نہ پنکھوں کا، البتہ دارالحدیث میں چونکہ اسباق رات میں بھی ہوتے تھے، وہاں بجلی تھی، پنکھے وہاں بھی نہیں تھے۔ سہ ماہی امتحان کے کچھ بعد تک ''ہدایہ'' کا سبق ''کتاب المکاتب'' تک ہوگیا تھا۔

حضرت مولانا کا ''ہدایہ'' کے سبق میں ایک خاص طریقہ تھا کہ کبھی کبھی وہ سبق کے دوران ایک آدھ سطر بغیر مطلب بیان کئے ہوئے چھوڑ دیا کرتے تھے اور جب وہ بحث پوری ہوجاتی تھی تو جو طالب علم عبارت پڑھ رہا ہوتا تھا اس سے فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! اس عبارت کا کیا مطلب ہے، مولانا کے یہاں غلط عبارت پڑھنے پر سخت گرفت ہوتی تھی، اس لئے بیچارہ طالب علم اگلی عبارت کی تیاری میں مشغول ہوتا تھا۔ اس کو خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ وہ جگہ کون سی ہے جس کا مطلب مولانا پوچھ رہے ہیں ہمارے سبق میں یہ حادثہ کئی مرتبہ پیش آیا اور اچھے اچھے ممتاز طالب علم جواب نہ دے سکے اور استاد کے زجر اور سرزنش کا شکار بنے، وہاں ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ عبارت پڑھنے والوں کے نام مولانا کے پاس ہوتے تھے وہ کسی کا بھی نام کبھی ترتیب کے مطابق اور کبھی خلاف ترتیب پکار دیا کرتے تھے، ایک دن یہ افتاد مجھ پر پڑی اور مولانا نے فرمایا کہ ہاں اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ مجھے وہ عبارت معلوم نہیں تھی، میں آئندہ پڑھی جانے والی عبارت کی تیاری کررہا تھا تو میری خاموشی پر مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی فکر ہے کہ عبارت میں میری غلطی پر گرفت نہ ہو اور اس کا خیال بالکل نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، میرے برابر میں مولوی رفیق احمد صاحب موجود تھے میں نے ان کو اشارہ کیا کہ عبارت کہاں ہے انہوں نے انگلی رکھ کر بتادیا جتنی دیر مولانا نے میری گرفت فرمائی میں نے اسی مختصر وقفے میں حاشیہ دیکھ عرض کیا کہ حضرت اس کا مطلب یہ ہے تو مولانا کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور فرمانے لگے آپ نے دیکھا ان کو حاشیہ دیکھنے میں کتنی مہارت ہے۔

استاد کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش: ہدایہ اخیرین جب ہم مولانا کے پاس پڑھ رہے تھے تو مولوی رضوان صاحب مظفر نگری کا کمرہ دارالعلوم کے مرکزی مشرقی دروازے کے ساتھ باہر ہوا کرتا تھا اور اس کمرے میں ایک کھڑکی اندر کی جانب حضرت مولانا کے کمرے میں کھلتی تھی، اگرچہ وہ بند رہتی تھی، ہم مولوی رضوان صاحب کے ساتھ اس کمرے میں ہدایہ اخیرین کا تکرار کیا کرتے تھے اور غرض یہ ہوتی تھی کہ مولانا تک آواز پہنچے اور وہ خوش ہوں، اسی طرح سردی کے موسم میں مولانا کے کمرے کے سامنے مسجد کے صحن میں مولوی عبداللطیف جہلمی صاحب کے ساتھ ہدایہ کا تکرار کیا کرتے تھے اور آتے جاتے مولانا ہم لوگوں کو تکرار کرتے ہوئے دیکھتے تھے، کبھی ہمارے درمیان اختلاف ہوتا تھا تو میری تو ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن مولوی عبداللطیف صاحب کتاب لے کر مولانا کے کمرے میں اس مقام کو پوچھنے کے لئے چلے جایا کرتے تھے، میں بھی ساتھ ہوتا تھا۔ اس سے بھی حضرت کو خوش کرنا ہی مقصود ہوتا تھا۔ (جاری......)☆